

حکمتِ دین

مفہوم، تقاضے اور بنیادی اصول

خرم مراد

جو تحریک اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے کھڑی ہوئی ہو، اس کو جہاں ایک طرف اللہ کے دین، اس کے احکام و ہدایات اور اس کی تعلیمات کا علم ہونا چاہیے، وہاں اسے حکمت کے زیور سے بھی آراستہ ہونا چاہیے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فرائض بیان کیے ہیں، ان میں تلاوت آیات اور تزکیہ نفوس کے ساتھ ساتھ تعلیم کتاب و حکمت کا بھی ذکر کیا ہے۔ بعض کے نزدیک ”آیات“ سے مراد قرآن مجید کے دلائل اور ”کتاب“ سے مراد قرآن مجید کے احکام ہیں، جب کہ ”حکمت“ کے مفہوم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

حکمت کا مفہوم

بعض کے نزدیک ”حکمت“ سے مراد حدیث کا ذخیرہ ہے۔ یہ مفہوم بھی اپنی جگہ صحیح ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ سمجھ بوجھ، وہ ذہن اور وہ دل و دماغ ہے جو دین کا صحیح فہم رکھتا ہو، جو دین اسلام کے احکام کے اسرار، ان کی علت اور ان کی حکمت سے واقف ہو، نیز جو مختلف حالات میں دین کو صحیح طور پر منطبق کر سکے۔

اسی طرح اسلام کے احکام کی مصلحتوں، مثلاً نماز کیوں فرض کی گئی؟ شراب کیوں حرام کی گئی؟ کا ذکر ہو یا دین کے مختلف احکام کے بارے جب بھی سوال پیدا ہو، تو یہ بھی حکمت کے دائرے میں آئے گا۔ حکمت سے مراد دین کے وہ بنیادی اصول بھی ہیں، جن پر دین کی تعلیمات کا پورا نظام قائم ہے۔ حکمت کا یہ مفہوم اپنی جگہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ اگر اس کا صحیح فہم ہو تو نہ صرف یہ کہ دین کی تعلیمات سمجھ میں آسکتی ہیں، بلکہ جن معاملات میں دین کی تعلیمات نہیں دی گئی ہیں، ان کے بارے میں بھی انسان اس فیصلے پر پہنچ سکتا ہے، جو دین کو مطلوب ہے۔

ظاہر ہے کہ دین نے ہر موقع، ہر واقعے اور ہر حالت کی مناسبت سے احکام کی وضاحت نہیں کی ہے۔ جو دین گذشتہ چودہ سو سال ہی نہیں بلکہ آئندہ زمانے کے لیے بھی ہے، جسے تمام اقوام عالم اور انسانی معاشروں کو رہتی دنیا تک کے لیے راہ نمائی دینا ہے، اس کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ چند نہایت بنیادی اصولوں کی وضاحت اور ان کا تعین تو کر دے جن کے نور سے پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کیا جاسکے، مگر ہر معاملے کے لیے تمام تفصیلات کو پہلے سے نہ طے کرے۔ لہذا، دین کے ان اصولوں کا فہم، جن کی بنیاد پر آئندہ دینی تعلیمات کی روشنی میں نظام مرتب ہو، ”حکمت“ کا ایک بڑا اہم پہلو ہے۔

حکمت کے اس مفہوم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ دین نے مختلف اصول و ضوابط کے درمیان باہمی ربط اور ان میں ترجیحات کا نظام قائم کیا ہے اور اسی بنیاد پر دین کی پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اس باہمی ربط اور ترجیحات کے نظام کا صحیح فہم تو ضروری ہے ہی، مگر دین کو سمجھنے اور دین کی اشاعت اور اقامت کے لیے سرگرم تحریک اسلامی کے لیے، مختلف حالات کے تناظر میں، اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ موثر نظام جماعت، متوازن نظام تربیت، مختلف حالات اور مواقع پر دین کو صحیح طور پر پیش کرنے، رائے عامہ کو ہموار کرنے، موثر حکمت عملی اپنانے اور صحیح تنظیمی فیصلے کرنے کے لیے، حکمت کے اس مفہوم کا ٹھیک ٹھیک فہم حاصل کرنا، تحریک اسلامی کے لیے بڑا ضروری اور اہم ہے۔ محض چند احادیث کو یاد کر لینے اور مسائل کو ازبر کر لینے سے یا صرف قرآن مجید کو حفظ کر لینے سے، حکمت کے موثر فہم کے وہ تقاضے پورے نہیں ہوتے، جو کہ ناگزیر ہیں۔

حکمت دین کے بنیادی اصول

حکمت کے بے شمار پہلو ہیں، لیکن میں یہاں صرف ان اہم پہلوؤں کی طرف اختصار سے اشارہ کروں گا، جو میری نظر میں تحریک اسلامی کے لیے اہم ہیں۔ ایک اسلامی تحریک کے لیے، اپنے نظام کی صحیح خطوط پر تشکیل، پالیسی سازی، طریق کار کے تعین، افراد کی تربیت، دعوت کو موثر انداز میں پیش کرنے اور عوام الناس کو منظم کرنے کے لیے، ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہی وہ اصول ہیں جن پر دین کی پوری عمارت قائم ہے۔

انتخاب اور عمل کی آزادی

اس ضمن میں پہلی بات جسے قرآن مجید نے بنیادی اصول کے طور پر پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا کے اندر اپنے عمل کی آزمائش کے لیے آیا ہے۔ یہ ظاہر تو یہ بات بڑی سادہ اور عام ہے لیکن اس کے مضمرات، نتائج اور تقاضے بڑے گہرے اور ہمہ گیر ہیں۔ وہ لوگ جو اس بات کو زبان سے دہراتے ہیں، وہ بھی اس کے مفہوم سے بتوائف ہوتے ہیں، اور جو اس کو جانتے ہی نہیں وہ تو اس سے بتوائف ہیں ہی۔

ضروری ہے کہ اس اصول پر ذرا تفصیل سے غور کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کون کون سے اہم پہلو ہیں جو اس ایک اصول میں مضمر ہیں۔

قرآن مجید نے حکمت دین کا پہلا اصول ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيْكُمُ احْسَنُ عَمَلًا (الملک ۶۷: ۲)

جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کس کا عمل اچھا ہے۔

انسان کو زندگی اور عرصہ حیات بخشنے کا بنیادی طور پر یہی مقصد ہے۔ اس اصول کا پہلا اہم تقاضا یہ ہے کہ انسان کو ارلوے، انتخاب اور عمل کی آزادی دی جائے۔ کسی امتحان میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے جب تک کہ امتحان دینے والے کو انتخاب اور عمل کی آزادی حاصل نہ ہو۔ یہ انسان کی بالکل بنیادی آزادی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہے۔ اگر اس پر کسی قسم کا کوئی جبر ہو اور جبر کے تحت وہ کوئی کام کرنے پر مجبور ہو تو پھر ان اعمال کی حد تک وہ اللہ کے ہاں جواب دہ نہیں ہے۔۔۔ اسلام میں جبر اور سزا کا پورا نظام اسی اصول کے تحت قائم کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں بھی جنت اور دوزخ کا ذکر آیا ہے، وہاں یہی کہا گیا ہے کہ یہ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کسی کے ذہن میں یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے عمل کی بنیاد پر جنت کا مستحق ٹھیرے گا یا رحمت کی بنیاد پر؟ اس بارے میں میرے ذہن میں کوئی الجھن نہیں ہے۔ دراصل اعمال کی بنیاد پر ہی انسان رحمت کا مستحق ٹھیرے گا۔ بے عمل آدمی، رحمت کا مستحق نہیں ہو گا۔ جس نے عمل کی کوشش کی ہوگی وہی اللہ کی رحمت کا مستحق ہو گا، اللہ کی رحمت اسی کی دست گیری کرے گی اور وہی جنت میں داخل ہو سکے گا۔ جس کے اعمال لعنت کے مستحق ہوں گے، اسے اللہ کی رحمت سے دور کر دیا جائے گا اور رحمت سے یہ دوری اسے جہنم میں لے جائے گی۔

اگر کسی کے ذہن میں ان دونوں باتوں کے بارے میں کوئی الجھن ہے، تو اسے قرآن پر غور کرنا چاہیے۔ قرآن نے واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ تو ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کا ذکر ہم قدیم صحیفوں یعنی صحف ابراہیم و موسیٰ سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ سورۃ النجم میں ارشاد ہے:

اَمْ لَمْ يَنْبَأْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوسٰى وَابْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفٰى ۝ اَلَا تَزِدُّوْا ذُرًّا وَّزْرًا لِّاٰخِرٰى ۝ وَاَنْ لِّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنْ سَعِيْهٖ سَوْفَ يُّرٰى ۝ ثُمَّ يَجْزٰى الْجَزَاءَ الْاَوْفٰى ۝ (النجم ۵۳)

(۳۱-۳۶)

کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان

ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا؟ ”یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا“ اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے، اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی۔“

قرآن مجید نے یہاں یہ بات بالکل صاف اور واضح طور پر کھول کر بیان کر دی ہے کہ یہ تو ابدی تعلیم ہے اور ان تعلیمات میں سے ہے جو دین کی بنیاد ہیں۔ اسی لیے حضرت آدمؑ کو جنت میں داخل کرتے ہوئے اللہ نے انہیں یہ اختیار دیا تھا کہ چاہیں تو پھل کھائیں اور چاہیں تو نہ کھائیں۔ اسی اختیار کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے پھل کھلایا، جب کہ فرشتوں کو یہ اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے سجدہ کیا، اس لیے کہ وہ مجبور تھے۔ حضرت آدمؑ کو مجبور نہیں کیا گیا تھا بلکہ انہیں اختیار کی آزادی دی گئی تھی۔ اس چیز نے ان کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہستی بنا دیا تھا۔ وہی آدمی جواب دہ ہو سکتا ہے اور اسی سے باز پرس ہو سکتی ہے، جس کو آزادی دی گئی ہو۔ چنانچہ قرآن مجید نے انبیاء کرامؑ کو بھیجنے کی بھی یہی علت بیان کی ہے کہ ہم نے انبیاء علیہم السلام کو ہدایت کے ساتھ اسی لیے بھیجا، تاکہ تمہارے پاس ہمارے خلاف کوئی حجت نہ رہے، اور کل تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ دین کیا ہے؟ اور ہدایت کیا ہے؟ ہم دین پر کیسے چلیں اور اللہ کی مرضی کس ۱۷ پوری ہو؟

اسی طرح ایمان کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؑ کو بار بار اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم نے تم کو یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ تم جس کو چاہو ایمان کی راہ پر لے آؤ، یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک اللہ کی مشیت ساتھ نہ دے اور اس کے قانون کے تحت یہ کلام نہ ہو، تو کوئی آدمی ہدایت نہیں پاسکتا۔

اللہ نے اس بات کو کھول کر یوں بیان کیا ہے کہ:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرًا لِّمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ۝ (ق ۵۰:۳۷)

اس تاریخ میں عبرت کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو، یا جو توجہ سے بات کو سنے۔ گویا قرآن میں بھی ہدایت اس کے لیے ہے جو دماغ سے سوچنے اور کان سے سننے کے لیے تیار ہو۔ جو سنتا، دیکھتا اور سوچتا نہ چاہے، وہ اس سے ہدایت نہیں پاسکتا۔ نبی کا کلام صرف اتنا ہے کہ وہ حق کو بیان کر دے، لوگوں کے سامنے اسے آشکار کر دے اور حق کو قائم کرنے کی کوشش کرے۔ پھر فَعَمَّنْ شَاءَ فَلَیُّوْمِنٌ وَ مَن شَاءَ فَلْیُکْفُرْ (الکہف ۵۸:۲۹) ”اب جس کا دل چاہے مانے، جس کا دل چاہے وہ انکار کر دے“ کے مصداق لوگوں کو اس بات کی آزادی ہوگی کہ چاہے وہ ایمان لائیں یا نہ لائیں۔

انسان کو حق قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار اور آزادی دی گئی ہے۔ یہ نبی کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ لوگ اس کی ہدایت پر ضرور اسلام قبول کریں۔ نبی کو داروغہ، تھانیدار یا جرنیل بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے کہ وہ

زبردستی لوگوں کو دین میں لے آئے۔ لا اکرہ فی الدین (البقرہ ۲۵۶:۳) ”دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔“ میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لہذا، اگر زبردستی ہوگی تو یہ انسان کی آزادی کے اندر مداخلت ہوگی جو حکمت دین کے خلاف ہے۔

انسان کو اس بات کی آزادی دی گئی ہے کہ وہ چاہے راستے پر جائے یا نجات کی راہ پر چلے، چاہے تو تقویٰ کی راہ اختیار کرے یا فجور کی راہ، اور چاہے تو اپنے نفس کا تزکیہ کرے یا خواہشات نفس کی پیروی کرے۔ اس کو یہ سارے اختیارات آزادی عمل کے تحت دیے گئے ہیں۔ جو بھی اس آزادی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے گا، وہ دراصل زندگی کے بنیادی مقصد میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ یہ اصول بھی قرآن و حدیث میں متعدد جگہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ وہی نیکی کام آئے گی جو آدمی اپنے ارادے سے کرے گا۔ اگر آدمی غلطی سے یا کسی جبر کے تحت کوئی غلط کام کر بیٹھے تو اس پر اس کا کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اس اصول سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار ہے۔ یہ آزادی و خود مختاری اس کے امتحان کے لیے ضروری ہے۔ موت کے بعد جزا اور سزا کا پورا نظام اسی اصول پر قائم ہے۔ آدمی اسی لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے کہ اسے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

اس مسئلے کا کوئی تعلق جبر و قدر کے مسئلے سے نہیں ہے کہ آدمی مجبور ہے۔ ایک ہی چیز کو دیکھنے کے کئی پہلو اور کئی زاویے ہوتے ہیں۔ اگر اس پوری کائنات کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت تصور کیا جائے تو یہاں کوئی فرد، کوئی کام بھی اللہ کی مشیت کے بغیر نہیں کر سکتا۔ اگر ایک شخص اپنے ہاتھ سے چوری کرنا چاہے تو ہاتھ تو اللہ تعالیٰ کا ہتھیا ہوا ہے، اس لیے جب تک ہاتھ چوری میں اس کا ساتھ نہ دے، اس وقت تک وہ چوری نہیں کر سکتا۔ گویا جب تک اللہ کی مشیت اس کا ساتھ نہ دے، اس وقت تک وہ چوری نہیں کر سکتا۔ مگر اس کے لیے مشیت کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا، اس لیے کہ ہاتھ استعمال کرنے کا ارادہ تو اس کا اپنا ہے۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ ہم نے دل پر مر لگا دی یا ہم نے یہ کام کروایا ہے، تو وہ یہ بات مالک ارض و سموات کی حیثیت سے فرماتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی سطح پر مخاطب کرتا ہے تو پھر وہ کہتا ہے کہ اس امر کے تم خود ذمہ دار ہو، کیونکہ تم بخوبی جانتے ہو کہ آزادی عمل کا اختیار تمہیں حاصل ہے۔ تم چاہو تو جھوٹ بولو یا سچ، ظلم کرو یا انصاف، نیکی کی راہ اختیار کرو یا بدی کی راہ، تمہیں اس امر کی مکمل آزادی اور اختیار حاصل ہے۔ اگر کہیں تم ثابت کرو کہ تم مجبور تھے تو ہم تم سے اس پر کوئی مواخذہ نہیں کریں گے اور تمہیں کوئی سزا نہیں دیں گے۔ اسی طرح اگر کہیں تم بدی کرنے پر مجبور ہو جاؤ یا کسی نے تمہارا ہاتھ پکڑ کر کوئی برا کام تمہارے ارادے اور مرضی کے خلاف تم سے کروایا تو اس کے بھی تم ذمہ دار نہیں ہو۔

اسی لیے انسان کا کوئی عذر قیامت کے دن سنا نہیں جائے گا۔ مگر اس کھلی حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ انسان کو ارلوے اور اختیار کی آزادی بخشی گئی ہے، وہیں بھی انسان کی عذر پیش کرے گا کہ 'لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ' (الزخرف ۲۰: ۲۳) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم جنوں کی پرستش نہ کرتے۔ اللہ فرمائے گا: نہیں! یہ بات غلط ہے۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ پھر وہ کہیں گے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے ہمیں اسی بات کی تعلیم دی تھی۔ وہ صدیوں سے یہی کام کرتے چلے آئے تھے۔ انسان کمزور ہے، معاشرے میں ڈھل جاتا ہے، ہم بھی تو آخر انسان ہی تھے، کیا کرتے؟ مجبور تھے۔ مگر یہ عذر بھی قبول نہیں ہو گا۔ لوگ کہیں گے کہ یہ ہمارے بڑے اور بزرگ تھے جو ہمارے آگے آگے جا رہے تھے، اس لیے ہم ان کے پیچھے چلے گئے، یا یہ کہیں گے کہ یہ ہمارے پیر، پرہت، پیجاری اور حکمران تھے، اس لیے ہم نے ان کی پیروی کی۔ کہا جائے گا: نہیں، یہ عذر بھی قائل قبول نہیں۔ پھر لوگ اللہ سے مطالبہ کریں گے کہ ان کو ہم سے زیادہ عذاب دیا جائے۔ اس پر اللہ فرمائے گا: نہیں، سب کے لیے یکساں عذاب ہے۔ بعد میں آنے والے کہیں گے کہ یہ تو پہلے جانے والوں کا طریقہ تھا جس پر ہم چل رہے تھے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: نہیں، پہلے والے اور بعد والے، دونوں کے دونوں آگ کے عذاب میں جلیں گے، کوئی اپنے اعمال کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتا۔

یہ تمام پہلو قرآن مجید میں مختلف مقلات پر بڑی تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔ یہی وہ بنیادی تصور ہے جس پر سارا دین قائم ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے امتحان کے لیے بھیجا ہے اور اس غرض کے لیے اس کو ارلوے و اختیار کی آزادی دی ہے۔ انسان کو اختیار ہے کہ وہ جس راہ پر چاہے، چلے۔ اپنے نفس کو جس راہ پر چلانا چاہے، چلائے۔ یہ اس کا اپنا فعل ہے جس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے۔ اگر یہ آزادی اس کو حاصل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا جزا اور سزا کا نظام صحیح بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتا۔

تحریک اسلامی کے لیے اہمیت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اصول کا تحریک اسلامی سے کیا تعلق ہے؟ ملکی حالات کے تناظر میں، تحریک اسلامی کی حکمت عملی یا جماعت کے نظم اور نظام تربیت سے اس کا کیا تعلق ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ حکمت دین کے اس پہلو کا تحریک اسلامی کے نظم، نظام تربیت اور حکمت عملی کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ تحریک کے عملی تقاضوں اور عملی نتائج پر اس کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگرچہ قرآن و سنت میں واضح طور پر کہیں بھی ایسے اصول یا احکام نہیں دیے گئے ہیں کہ کن حالات میں کیا کرنا چاہیے، مثلاً مخصوص حالات میں کسی فرد، جماعت یا حکومت وقت کے ساتھ کیا پالیسی یا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟۔ لیکن اگر تحریک اور دین کا کام کرنے والے حکمت کے اس مفہوم کو بخوبی سمجھ لیں کہ مخصوص حالات میں تحریک اسلامی کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے یا کیا حکمت عملی اپنانا چاہیے؟ تو اس کے

لئے ایسے راہنما اصول بن سکتے ہیں، جن کی روشنی میں بہت سے معاملات طے ہو سکتے ہیں۔ گویا تحریک اسلامی کے لئے حکمت دین کا یہ پہلو اور اصول نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

طریق دعوت کا تعین

اس ضمن میں پہلی بات طریقہ کار سے متعلق ہے۔

قرآن مجید نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ دین کو پھیلانے اور غالب کرنے کا طریقہ کار صرف تبلیغ کا طریقہ کار ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ کار قابل قبول نہیں ہے۔ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے اور اللہ کی زمین پر عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے کے لئے تو انسان قوت استعمال کر سکتا ہے مگر لوگوں کو دین کی طرف بلانے اور دین قبول کرنے کے لئے قوت کا استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے جہاں بھی مسلمانوں نے ملک فتح کیے، لوگوں کو پوری مذہبی آزادی دی۔ اگر کوئی عیسائی رہتا چاہے تو وہ عیسائی رہے، اپنے قانون پر ہی عمل کرے اور معاملات کے فیصلے اپنے قانون کے تحت کروانے کے لئے اپنی عدالتیں الگ سے بنائے۔ اسی لئے عالم اسلام میں یہودیوں کی عدالتیں الگ تھیں اور عیسائیوں کی عدالتیں الگ۔ ان کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کے گرجا گروں اور عبادت گاہوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا اور نہ عبادت کرنے پر کسی قسم کی کوئی پابندی لگائی گئی۔ اس کے لئے اس وقت بھی قرآن مجید کا یہی اصول سامنے تھا کہ جو اپنے عقیدے اور ضمیر کے مطابق، جس مذہب پر چلنا چاہے، وہ اس پر چل سکتا ہے۔ اس میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کا طریقہ ہی دین کا بنیادی طریقہ ہے۔ تبلیغ کے ذریعے عالم آدمی کو متاثر کر کے، دین کے لئے کھڑا کرنا ہی اقامت دین کا صحیح طریقہ ہے۔

اسی اصول کی روشنی میں تحریک اسلامی نے اقامت دین کا طریقہ کار متعین کیا ہے اور اسے اپنے دستور کا حصہ بنایا ہے۔ جس کے مطابق تبلیغ اور تلقین کے ذریعے لوگوں کی فکر کو بدلنا، رائے عامہ کو ہموار کرنا اور انہیں منظم کر کے تہذیبی لانا ہے۔ یہ ہمارا بنیادی طریقہ ہے۔ یہ طریقہ دین کے اس محکم اصول سے ثابت ہوتا ہے جس کے مطابق انسان امتحان کے لئے بھیجا گیا ہے۔ وہ دین کو قبول یا رد کرنے میں آزاد ہے۔ اس پر جبر نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی خاص راستے کو اختیار کرے۔

اگر غور کریں تو تبلیغ کے لئے چند شرائط ضروری ہیں:

تبلیغ کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ کہنے والے کو کہنے کی آزادی میسر ہو۔ اگر کہنے والا اپنی بات کہہ نہیں سکتا تو اس کی بات پہنچ نہیں سکتی، ابلاغ نہیں ہو سکتا لہذا کہنے والے کو بات کہنے کی آزادی ہونی چاہیے اور سننے والے کو بات سننے کی۔ اس لئے تبلیغ کا عمل تو اسی وقت کارگر ہو سکتا ہے، جب سننے والے کو سننے اور قبول کرنے کی آزادی حاصل ہو اور پھر جسے وہ قبول کر لے، اس پر چلنے کی اسے آزادی ہو۔

قرآن مجید میں مختلف مقالات پر مختلف حوالوں سے اس پہلو کا تذکرہ ملتا ہے۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ تم ان کا راستہ کیوں روکتے ہو؟ یَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (الانفال: ۸: ۴۷) یا یہ کہ اللہ کے راستے سے روکنا کبائر گناہ میں سے ہے۔ اسی طرح لوگوں کو اپنے ضمیر اور عقیدے کے مطابق چلنے کی آزادی نہ دینے کو قرآن نے وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (البقرہ: ۲: ۲۱۷) (اور فتنہ خون ریزی سے شدید تر ہے) قرار دیا ہے۔ گویا خون بہانے سے بڑا جرم یہ ہے کہ انسانوں پر یہ جبر کیا جائے کہ ان کو ان کے گھروں سے اس جرم میں نکلا جائے کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے۔ ان کا راستہ روکا جائے اور ان کے کاموں میں رکاوٹ ڈالی جائے یا ان کی بات نہ سنی جائے، محض اس لیے کہ یہ ہمارے دین کو نہیں مانتے۔ یہ تمام باتیں تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ اور انسان کی آزادی رائے پر قدغن ہیں۔

یہ وہ بنیادی آزادی ہے جس کا قرآن بڑی شدت سے تحفظ کرتا ہے۔ وہ کہیں نہیں کہتا کہ تبلیغ کے لیے جبر سے کام لو۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی عقل سے کام لو، اپنے کلاموں سے سنو، اپنی آنکھوں سے دیکھو، اپنے دماغ سے سوچو اور حق کو پہچاننے کے بعد اسے قبول کر لو۔ وہی راستہ تبلیغ کے لیے موثر راستہ ہے جس میں سننے کی بھی آزادی ہو، سنانے کی بھی آزادی ہو اور قبول کرنے کی بھی آزادی ہو۔ گویا آدمی جس بات کو حق پائے اور اسے قبول کر لے تو اس پر چلنے کی بھی اسے آزادی حاصل ہو۔ اب اسے جمہوریت کہا جائے یا بنیادی حقوق یا کوئی بھی اصطلاح استعمال کی جائے، ممکن ہے چھٹی صدی میں اس کے لیے کوئی اور اصطلاحات ہوں یا تیسویں صدی میں کوئی دوسری اصطلاحات آجائیں، لیکن بنیادی طور پر سب کی روح یہی ہے۔

آج اتنے سہل گزرنے کے بعد لوگ پوچھتے ہیں کہ آخر تحریک اسلامی کو جمہوریت سے کیا عشق ہے؟ جمہوریت نے ملک کو کیا دیا ہے؟ یہ سوائل اٹھانے والے احباب دراصل اس بنیادی بات کو نہیں سمجھتے اور دین کی اس بنیادی حکمت سے نا آشنا ہیں جس کی بنیاد پر تحریک نے اپنا طریقہ کار متعین کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس ملک میں بنیادی آزادیاں برقرار رہیں، یعنی بات کہنے سننے کی آزادی، اپنے عقیدہ و نظریہ کے مطابق عمل کرنے کی آزادی اور ملکی نظام کو آزادی رائے کا احترام کرتے ہوئے چلانے اور دلیل سے تبدیل کرنے کی آزادی۔

مسئلہ طریق انتخاب کا نہیں ہے، بلکہ یہ اس بنیادی اصول کا مسئلہ ہے جس کے مطابق انسان امتحان گاہ میں ہے، اور وہ اپنے لیے راہ زندگی منتخب کرنے کے لیے آزاد ہے۔ اس لیے اس کو دوسرے کی بات کو سننے، قبول کرنے اور اپنے عقیدے اور رائے کے مطابق چلنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ اسے حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہے نظام بنائے، جس میں اسے ان آزادیوں کا تحفظ مل سکے۔ نظام کے خدوخل اور تفصیلات ہر زمانے میں ہر معاشرے میں اور ہر ملک میں مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن اس کی بنیادی روح کو مجروح نہیں کیا جاسکتا۔

اسی لیے قرآن مجید ان تمام حکمرانوں اور سرداروں کی مذمت کرتا ہے جو حق کا راستہ روکتے ہیں، اس کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور لوگوں کو اس راہ حق پر چلنے سے جبری طور پر روکتے ہیں۔ یہ بات کسی صورت میں برداشت نہیں کی جاسکتی کہ انسان کے لوپر کسی بھی قسم کی جبریت اور آمریت مسلط کی جائے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

فریضہ اقامت دین کے حوالے سے تحریک اسلامی کے کارکنوں میں ایک رائے یہ بھی پائی جاتی ہے کہ قرآن کی آیت: وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا اللَّبْلُغُ الْمُمَيَّنُ ○ (ہنس ۳۶: ۱۷) اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچانے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے، یا اِنْ عَلَيْكَ إِلَّا اللَّبْلُغُ (الشوریٰ ۳۳: ۳۸) تم پر تو صرف بات پہنچانے کی ذمہ داری ہے، کی روشنی میں ہمارا کام بس اتنا ہے کہ ہم تبلیغ کر دیں اور اپنی بات پہنچادیں۔ اس سے زیادہ جدوجہد کرنا اور نظام کو قائم کرنے کے لیے محنت کرنا، یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ درحقیقت یہ بات آیت کے صحیح مفہوم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کہی جاتی ہے۔

جب قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اِنْ عَلَيْكَ إِلَّا اللَّبْلُغُ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بنیادی ذمہ داری جس کے لیے تم جواب دہ ہو، وہ دراصل حق بات پہنچانا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ عوام الناس تک حق بات پہنچانے کے بعد اسلامی نظام اور دین کا قائم ہونا یا شریعت کا نافذ ہونا، یہ کسی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ یہ لانا کر کے دکھا دے۔ اگر وہ کوشش کے بلوجود اس میں کامیاب نہ ہو، تو اس کے لیے وہ ذمہ دار نہیں ہے اور اس کے لیے اس سے باز پرس نہیں ہوگی۔ لیکن جس نے ابلاغ کی ذمہ داری پوری نہیں کی، اس سے ضرور باز پرس ہوگی کہ تمہارے پاس حق تھا، تم نے کیوں نہیں پہنچایا؟ اسی لیے فرمایا ہے: وَلَنَسْتَلِئَنَّ الْمُرْسَلِينَ ○ (الاعراف ۷: ۶) ہم نے جن کو بھی بھیجا ہے ان کو حساب دینا ہو گا۔ اسی لیے روز محشر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے یہ پوچھیں گے کہ ہم نے تم تک جو حق بات پہنچائی تھی، کیا تم نے اسے دوسرے لوگوں تک پہنچایا، یا نہیں۔ ان سے اس بات کا جواب طلب نہیں کیا جائے گا کہ انہوں نے دین کو قائم کیا، یا نہیں۔ البتہ تمام رسولوں اور امت مسلمہ کو اس بات کے لیے ضرور جواب دہ ٹھہرایا جائے گا کہ انہوں نے ابلاغ کا فریضہ انجام دیا، یا نہیں۔

اس لیے وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا اللَّبْلُغُ کے معنی دراصل یہ ہیں کہ تم لوگوں کو دین کی راہ پر زبردستی لانے کے ذمہ دار نہیں ہو۔ قرآن مجید نے یہ بات کئی مقالات پر مختلف پیرایوں میں بیان کی ہے، مثلاً تم چاہو تو میٹھی لگا کر آسمان پر چڑھ جاؤ اور چاہو تو سرنگ کھود کر زمین میں گھس جاؤ، لیکن لوگوں کو صحیح راستے پر لانا تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ وَمَا لَنْتَ عَلَيْهِمْ بِبُوكِيْلٍ ○ (الانعام ۶: ۱۰۷)۔ یعنی ہم نے تم کو وکیل، محافظ یا داروغہ نہیں بنایا ہے۔ تم کو تو صرف یہ ذمہ داری دی ہے کہ اِنْ عَلَيْكَ إِلَّا اللَّبْلُغُ کے مصداق تمہارا کام حق بات

پہچانا ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگ جمع ہوں، ان کو لے کر جہاد کرنا اور اللہ کا نظام قائم کرنا، یہ تمام تفصیلات بعد کی ہیں، لیکن بنیادی ذمہ داری صرف ابلاغ کی ہے۔ یہ ذمہ داری اگر ادا نہیں ہوگی، تو تم اللہ کے ہاں قاتل سرزنش ہو گے اور تم سے باز پرس ہوگی۔

اقامتِ دین میں شخصیت کا کردار

تحریکِ اسلامی کے طریقہ کار کے حوالے سے اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ کوئی شخصیت یا انسان اتنا باکمل نہیں ہو سکتا کہ وہ مجمع عام پر ایک نگاہ ڈالے اور لوگ بدل جائیں۔ اس کی کوئی بنیاد دین اور قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو انبیاء کرامؑ کی نگاہ سے زیادہ کس کی نگاہ پاک اور بااثر ہو سکتی تھی؟ ان سے زیادہ کس کا کلام موثر ہو سکتا تھا؟ کس کے پاس ان سے زیادہ خلوص ہو سکتا تھا؟ اور کس کی شخصیت میں ان سے زیادہ کریمت اور معجزے ہو سکتے تھے؟

حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس تو یہ معجزہ تھا کہ اندھوں کی بیٹھلی واپس آ جاتی تھی، کوڑھی اچھے ہو جاتے تھے اور مفلوج چلنے لگتے تھے، یہاں تک کہ مردے بھی زندہ ہو جلیا کرتے تھے۔ لیکن جو انھیں سننے اور دیکھنے کو تیار نہیں تھے، ان کو سنتا اور دیکھتا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ یہودیوں کے علماء فقہاء اور عام افراد کانوں سے ان کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اپنے کان، آنکھیں اور دل و دماغ بند کیے رکھتے تھے۔ ان کے دلوں کی دنیا بدلنے کے لیے یہ معجزات بے اثر ہوتے تھے، حالانکہ جسمانی طور پر مفلوج اور مردہ زندہ ہو جلیا کرتے تھے۔ اس سے بڑے معجزات تو کسی کے پاس نہیں تھے، لیکن وہاں بھی اللہ کے اسی قانون کا اطلاق ہوتا تھا کہ جو خود دیکھتا چاہے گا وہی دیکھے گا، جو خود سنتا چاہے گا وہی سنے گا اور جو صراطِ مستقیم پر خود چلنا چاہے گا وہی چلے گا۔ غیب سے کوئی فرد نہیں آئے گا جو انسان کا ہاتھ پکڑ کر سیدھی راہ پر ڈال دے۔ یہ ہر فرد کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ راہ حق پر چلنے کی کوشش کرے۔ جو فرض ایک فرد پر عاید کیا گیا ہے، وہ فرض کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔

طاقت کے استعمال کا تصور

دعوت و تبلیغ اور تحریکِ اسلامی کے اصول و طریقہ کار کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ آدمی کا دل چاہتا ہے کہ غیب سے سب کی اصلاح کا سامن ہو جائے، یا لوگ کہتے ہیں کہ ”ایسے بے حس لوگوں کا علاج تو ڈنڈے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔“ یہ بات زبان زد عام ہے کہ ”قوم اتنی بگڑ چکی ہے کہ اس کا علاج صرف ڈنڈا ہے۔“ لیکن ڈنڈے سے قوموں کا علاج نہیں ہوتا بلکہ ڈنڈے سے تو قوموں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر ڈنڈے سے قوموں کا علاج ہو سکتا تو اللہ تعالیٰ سے زیادہ موثر ڈنڈا اور کس کا ہو سکتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو انبیاء کرامؑ علیہم السلام کو ڈنڈا تھما دیتا اور پوری کی پوری قوم کی اصلاح ہو جاتی، لیکن ڈنڈے سے

قوم کی اصلاح نہیں ہوتی اور نہ اللہ کو یہ مقصود ہے۔ قوموں کی اصلاح تو کھلے بندوں تبلیغ اور حق کو دل سے قبول کرنے سے ہوتی ہے۔ ہاں، ڈنڈے کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت استعمال کیا جب قوموں پر اتمام حجت ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے لوہے ڈنڈے کو استعمال کیا اور عذاب الہی کے نتیجے میں قوموں کی قومیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ البتہ اللہ نے کسی قوم کی اصلاح کے لیے ڈنڈے کا استعمال کبھی نہیں کیا۔

یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے راہ حق میں آزمائشوں کو برداشت کیا، مصیبتیں اٹھائیں، جدوجہد کی، سولی پر چڑھے، کوڑے کھائے، لیکن ہر حال میں اللہ کے دین کی تبلیغ کی اور اسی بات کی کوشش میں لگے رہے کہ لوگ اپنے اختیار اور ارادے سے حق کو قبول کریں اور راہ حق پر چلیں، تاکہ اللہ کے ہاں اپنے امتحان میں سرخرو ہو سکیں۔ اگر لوگ ڈنڈے کے زور پر نیکی کی راہ پر چلیں گے تو جنت میں جانے کے مستحق نہیں ہوں گے۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی ڈنڈے کے زور پر کسی برائی کا مرتکب ہو گا تو وہ بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ اس لیے ڈنڈے کے استعمال یا جبر سے لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا جائز نہیں ہے۔

تبلیغ اور موثر ابلاغ کا اصول

اقامت دین اور کار رسالت کی تکمیل کے لیے اگر کوئی راستہ ہے تو وہ صرف اور صرف تبلیغ اور موثر ابلاغ کا راستہ ہے۔ اللہ نے رسالت کی جس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اپنے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا، ان کا راستہ بھی یہی تھا۔ جو تحریک بھی اس کام کو مکمل کرنے کے لیے کھڑی ہو، جو کہ کار رسالت ہے، اس کو دین کی اس بنیادی حکمت اور اصول سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔

یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ فریضہ اقامت دین کی ادائیگی کا واحد راستہ وسیع پیمانے پر تبلیغ اور موثر ابلاغ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر فرد تک پہنچا جائے، اس کو دین کی دعوت دی جائے، اپنے ساتھ ملایا جائے اور اس کی زندگی کو بدلا جائے۔ اس کے نتیجے میں پھر وہ قوت پیدا ہو سکے گی جس کے ذریعے ایک صلح اور علولانہ نظام وجود میں آسکے۔ اس کے علاوہ ذہن میں جو بھی راستہ ہو، مثلاً کوئی مارشل لا لگ جائے، کوئی مرد صلح غیب سے آجائے اور وہ لوہے سے بیٹھ کر اصلاح کر دے، یہ ساری غلط فہمیاں دل سے نکال دینا چاہئیں کہ ان سے کوئی کام نہ پہلے ہوا ہے، نہ آج ہو سکے گا۔ اللہ کی سنت میں بھی اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس طرح سے قوموں کی اصلاح ہو سکے۔ یہی حکمت دین کا بنیادی اصول ہے اور فریضہ اقامت دین کی بنیاد بھی۔

(یہ تحریر کیسٹ سے تیار کی گئی ہے، تدوین: سلیم منصور خالد)